منفلوطی کے افسانوں اور مقالات کا مطالعہ

محمد اسحاق *

ABSTRACT:

Mustafa Lutfi El-Manfaluti was writer and poet; in this article his prose is discussed. He translated several short stories from French, although he couldn't read and speak French, he also wrote several essays and stories, his work represent early development of short stories and essays in modern Arabic Literature. His Short Stories and Essays are good combination of Classical and Romantic styles, but in his short stories realism is debatable.

خلاصہ:

مصطفیٰ لطفی المنفلوطی ادیب اور شاعر تھے، اس مقالے میں ان کے نثر پارے زیر بحث ہیں۔ انہوں نے فرانسیسی زبان سے عربی میں کئی افسانوں کا ترجمہ کیا جب کہ وہ فرانسیسی زبان نہ بول سکتے تھے اور نہ ہی پڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے مقالات اور افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں اور مقالات کا اسلوب جدید عربی ادب کے ابتدائی ارتقائی دور کی نمائندگی کررہا ہے۔ ان کے افسانے اور مقالات کلاسیکیت اور رومانسیت کا حسین امتزاج ہیں لیکن افسانوں کی کہانی میں واقعیت پر انگلی اٹھائی جاسکتی ہے۔

مختصر حالات:

مصطفیٰ لطفی المنفلوطی ۱۸۷۶ میں منفلوط میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم دیہات کے مدرسے میں حاصل کی اور قرآن حفظ کرلیا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً گیارہ سال تھی۔ پھر انہیں جامعہ ازہر میں حصول تعلیم کے لیے بھیج دیا گیا۔ ازھر میں دس سال حصول علم میں مشغول رہے جہاں شیخ محمد عبدہ تفسیر قرآن اور بلاغت میں شیخ عبدالقاھر الجرجانی کی ''دلائل الاعجاز'' اور ''اسرار البلاغۃ'' پڑھا رہے تھے منفلوطی شیخ محمد عبدہ کے خیالات ونظریات سے بہت متاثر ہوئے۔(۱)

* ڈاکٹر، پروفیسر شعبۂ عربی، کراچی یونیورسٹی، کراچی، پاکستان۔ ای میل: profdrishaq@gmail.com

تاریخ موصولہ: ۲۲ فروری ۲۰۱۰ء

منفلوطی کی طبیعت دینی علوم کے بجائے اصناف ادب کی طرف مائل تھی انہوں نے ابن المقفع، جاحظ اور حریری کی ادبی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا۔اسی طرح آمدی، باقلانی اور جرجانی کے علم تنقید و بلاغت کے نظریات پہ نظر ڈالی۔اعجاز قرآن اور قرآنی اسلوب کا حسن و جمال منفلوطی کی خصوصی دلچسپی کا موضوع تھا۔مشہور و معروف قدیم شعراء کا مطالعہ کیا۔منفلوطی کی ایک کتاب ''مختارات المنفلوطی'' کے نام سے ہے۔جس میں انہوں نے اپنا انتخاب پیش کیا تھا۔جس سے پتا چلتا ہے کہ قدیم عربی ادب کے سرچشموں سے پوری طرح سیراب ہوئے تھے(۲)

قیام ازہر کے دوران ہی منفلوطی کی ذہانت اور حُسنِ اسلوب کی شہرت ہونے لگی۔ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے ایک ہفت روزہ رسالہ میں خدیو عباس حلمی ثانی کی ہجو میں اشعار لکھے ہیں چنانچہ انہیں قید کی سزا دی گئی۔جیل میں اپنی سزا کی مدت پوری کر کے وہ اپنے گھر واپس چلے گئے۔وہاں دو سال تک رسالہ المویّد میں اپنے جوہر دکھاتے رہے۔(۳) سعد زغلول پاشا منفلوطی کی ادبی صلاحیتوں کے معترف تھے جب انہیں وزارت تعلیم کی ذمہ داری دی گئی تو انہوں نے منفلوطی کو انشا پردازی کی ذمہ داری سونپی۔جب وہ وزارتِ انصاف میں گئے تو منفلوطی بھی وہیں منتقل ہو گئے۔جب حکومت سعد پاشا کے مخالفین کے ہاتھوں میں آ گئی تو انہیں معزول کر دیا گیا لیکن جب سعد پاشا دوبارہ ۱۹۲۳ء میں پارلیمنٹ میں آئے انہیں پھر انشا پردازی کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔وہ آخر عمر تک اس منصب پر فائز رہے۔۱۹۲۴ء میں پچاس سال کی عمر میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔(۴)

منفلوطی کی تخلیقات:

وہ فکری اعتبار سے اسلامی اَقدار کے علمبردار تھے۔منفلوطی کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔سلاسل زندان اور وزارت کے خار مغیلاں نے ان کے اسلوب نگارش پر غم و اندوہ کی مہر لگا دی تھی۔زندگی کی سختیاں اور مصیبتیں ان کی تحریر میں جھلکتی ہیں۔النظرات منفلوطی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ان کے ہر مضمون میں یہی رنگ نمایاں ہے خصوصیت سے الغنی والفقیر (دولت منداور ضرورت مند) این الفضیلۃ؟ (اخلاق کہاں ہیں؟) اور ایھا المحزون! (اےغمزدہ!)۔(۵)

مشہور فرانسیسی ادیب برنارڈین ڈی سینٹ پیری کے ناول Paul -et- Virginie کا ترجمہ ''الفضیلہ'' کے عنوان سے کیا جو کہ عثمان جلال (۱۸۲۹-۱۸۹۸) کے ترجمے سے بہتر ہے۔اسی طرح Franceis Coppee (۱۸۴۲-۱۹۰۸) کے ڈرامے Paour - ca - Courne کا ترجمہ التاج کیا۔منفلوطی نے ترجمہ میں تعریب و تمصیر کو اس لیے اپنایا کہ قارئین اس میں اپنائیت اور قرب کا احساس پا سکیں۔تعریب اور تمصیر کا مفہوم ہے: کسی افسانے کو عربی اور مصری رنگ چڑھا کر لکھا جائے، کرداروں اور جگہ کے نام بدل دیے جائیں۔

العبرات:

یہ منفلوطی کی نو تخلیقات کا مجموعہ ہے جن میں سے آٹھ کو کہانیوں اور مختصر افسانوں میں شمار کر سکتے ہیں۔جب کہ آخری

تخلیق کو یادداشتیں یا ڈائری کہنا بہتر ہوگا۔ان میں سے چار افسانوں کے بارے میں کتاب میں طبع زاد ہونے کا دعویٰ ہے۔ الیتیم (یتیم)، الحجاب (پردہ)، الھاویۃ (گڑھا)، العقاب (سزا) باقی پانچ تخلیقات فرانسیسی ادب سے ترجمہ ہیں۔ الشہداء، الذکریٰ (یاد)، الجزاء (بدلہ)، الضحیۃ (قربانی)، مذکرات مارغریت (مارگریٹ کی یادداشتیں) (۶)

منفلوطی نہ فرانسیسی جانتے تھے اور نہ ہی کسی یورپی زبان پر عبور رکھتے تھے۔البتہ یورپی ادب وثقافت سے واقفیت کا انہیں انتہائی شوق تھا۔وہ یورپی ادیبوں کی عربی میں ترجمہ شدہ تحریریں پڑھتے تھے پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی یورپی ادب کی تخلیقات کا عربی میں ترجمہ کریں گے۔مگر وہ ترجمہ پر پوری طرح قدرت نہ رکھتے تھے۔انہوں نے اپنے دوستوں سے کچھ کہانیاں سنیں اور اپنے انداز وتخیلات سے عربی کا جامہ پہنا دیا۔ان افسانوں میں بہت کچھ بدل دیا گیا ہے بہ قول ڈاکٹر شوقی ضیف:

''منفلوطی نے ان فرانسیسی افسانوں کو مصری جامہ پہناتے ہوئے ان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ان کی اصلیت ختم کر دی ہے اس کا خیال یہ تھا کہ شاید قصے بھی مقالات کی طرح ہوتے ہیں کہ جن میں سے جو چاہا لے لیا اور جو چاہا چھوڑ دیا۔'' (۷)

منفلوطی کے جن افسانوں کے بارے میں طبع زاد ہونے کا دعویٰ ہے وہ بھی مشکوک ہیں کہ واقعی طبع زاد ہیں یا نہیں، اسی طرح جن افسانوں کے بارے میں ترجمہ کا دعویٰ ہے یہ نہیں معلوم کہ یہ کس کا ترجمہ ہے۔

منفلوطی کے افسانے:

منفلوطی کے افسانے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی طرح ہیں جن کا بنیادی مقصد معاشرتی برائیوں کی اصلاح ہے فن کی باریکیوں کو وہ اہمیت نہیں دیتے البتہ زبان کی سلاست وروانی، فصاحت وبلاغت بلکہ زبان کا چٹخارہ دونوں کے ہاں موجود ہے ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح اور منفلوطی کی العبرات اور النظرات کے کئی افسانے اسی انداز پر مشتمل ہیں۔منفلوطی ادیب کم اور مصلح زیادہ ہے۔ڈاکٹر محمود حامد شوکت لکھتے ہیں۔

''قصصی ادب کی جدید تحریک میں ایک ادیب، جو کہ عربی ادب پر عبور رکھتا تھا اور فرانسیسی ادب سے مالا مال تھا۔وہ اپنے ماحول کے کرداروں کو بنیاد بنا کر جدید انداز کا قصہ لکھتا ہے۔ہماری مراد محمد تیمور سے ہے۔اسی طرح منفلوطی جدید ادب سے متاثر ہوتا ہے لیکن دونوں میں بنیادی فرق موجود ہے۔ایک کرداروں کے احساسات وجذبات کی تصویر کشی کر رہا ہے جب کہ دوسرا زندگی کے حقیقی نشیب وفراز کو ابھار رہا ہے۔'' (۸)

''منفلوطی کے یہ افسانے عربی ادب کے جس دور کے ہیں اس دور کے ادبا اور مترجمین نے اپنی تحریروں اور قصوں پر غم واندوہ کی چادر چڑھا رکھی ہے۔ان قصوں کے تمام کرداروں پر آلام ومصائب کے سائے منڈلا رہے ہیں۔اس دور کے افسانے سطحیت اور عمومیت کے حامل تھے۔ان میں گہرائی نہ تھی۔ان کا اسلوبِ تحریر بھی یکسانیت کا شکار ہو چکا تھا۔'' (۹)

عربی ادب میں افسانہ اور ناول نے اسی طرح ارتقاء کی منازل طے کی ہیں۔جس طرح اردو ادب میں اسے کئی مراحل سے گزرنے کے بعد آج کی منزل نصیب ہوئی ہے جب اردو مختصر افسانہ معرضِ وجود میں آیا اس وقت اردو میں داستانی عہد

کی روایتوں کا کافی سرمایہ موجود تھا۔ پریم چند کے مختصر افسانوں کے ابتدائی مجموعوں میں اس روایت کے نقوش واضح نظر آتے ہیں۔ جس میں تصنع اور بناوٹ کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''پریم پچیسی'' میں داستان کی روایتوں کا اثر ہے۔ مقصدیت کے دبیز پردے میں فن اور اس کا حسن چھپ کر رہ گئے ہیں۔ ان کا انداز منفلوطی کی طرح خاصا اصلاحی اور تبلیغی ہے۔

''منشی پریم چند کی کہانی 'کفن'' اور منفلوطی کی کہانی ''یتیم'' کا ہم تقابلی مطالعہ کریں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ پریم چند فن کی گہرائی میں اُترے ہوئے ہیں جب کہ منفلوطی سطح آب پر تیر رہے ہیں۔ پریم چند کے افسانے میں مشرقی روایتوں اور فن کی نزاکتوں اور لطافتوں کی حسین آمیزش نظر آتی ہے۔ پریم چند نے نچلے طبقے کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔'' (۱۰) افسانہ نگاری کے فن کا پورا احساس کیا۔ فن کو فکر سے مربوط اور ہم آہنگ کر کے ''کفن'' کی تخلیق کی۔ ان کا افسانہ ایک نئے طرز کی بے باک اور بے رحم حقیقت نگاری کا نمونہ ہے۔ منفلوطی اپنے افسانے ''یتیم'' اور ''العبرات'' کے دوسرے افسانوں میں اس قسم کے کٹھن تجربے سے دوچار ہوئے مگر وہ اسے پوری طرح نباہ نہ سکے۔ ان کے ہاں واضح جھول نظر آتا ہے البتہ منفلوطی کی فکر میں ٹھہراؤ ہے جب کہ پریم چند پریشان خیالی کے عمیق غار میں محصور ہیں۔

منفلوطی کی افسانہ نگاری کا تقابل اگر حریری و ہمدانی کے مقامات یا جاحظ کی البخلاء (بخیلوں کی کہانیاں) سے یا ابن المقفع کی کلیلہ ودمنہ کی کہانیوں سے کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ منفلوطی کے ہاں جدت غالب ہے۔ قدیم وجدید روایات کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ افسانہ ''یتیم'' کی ابتدا دیکھیے۔ ''میرے پڑوس کی بلڈنگ کے اوپر والے کمرے میں کچھ دنوں سے ایک نوجوان رہایش پذیر ہے۔ اس کی عمر انیس یا بیس برس ہوگی، شاید وہ مصر کے کسی سیکنڈری یا ہائر سیکنڈری اسکول کا طالب علم ہے۔ میں اسے اپنے اسٹڈی روم کی کھڑکی سے اکثر دیکھتا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے ڈھیر ہوتا۔ میں دیکھتا کہ ایک پژمردہ، نحیف ونزار کمزور نوجوان ایک جلتے ہوئے چراغ کے سامنے کمرے کے کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ کبھی کسی کتاب میں نظر گاڑے ہوئے ہے اور کبھی کسی کاپی میں کچھ لکھ رہا ہے، کبھی کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کبھی کوئی سبق دہرا رہا ہے۔ میں نے کبھی بھی اس کے معمولات پر توجہ نہیں دی۔ البتہ ایک مرتبہ سردی کی لمبی رات تھی۔'' (۱۱) (افسانے کے کچھ حصے ضمیمہ نمبر ا پر دیکھیے)

منفلوطی کے طبع زاد افسانہ الحجاب (پردہ) جس کا انتہائی خوبصورت بامحاورہ ترجمہ حبیب اشعر دہلوی نے ''جب رخ سے نقاب اٹھی'' کیا ہے، یورپ کی غلامی کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں جو اخلاقی زوال آ رہا تھا اس کی بہترین عکاسی کرتا ہے کہ ایک مصری نوجوان فرانس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتا ہے تو اپنی باپردہ بیوی کو پردہ ترک کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ پردہ تو پسماندگی اور جہالت کی نشانی ہے اور اسے اپنے دوستوں کے ساتھ آزادانہ میل ملاپ پر مجبور کرتا ہے اس کی باحیا بیوی اسے سمجھانے کی کوشش میں ناکام ہو جاتی ہے آخر ایک دن اس کا ایک دوست اس کی بیوی کو اغوا کر

کے لے جارہا ہوتا ہے کہ دونوں کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے تب اسے ہوش آتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کس غلط راستے پر چلنے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

اسی طرح اس کا دوسرا طبع زاد افسانہ الھاویۃ (گڑھا) جس کا ترجمہ حبیب اشعر دہلوی نے شرابی کیا ہے۔اس میں منفلوطی نے جدید تہذیب کی نقالی میں شراب نوشی اختیار کرنے کے نقصانات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اس طرح منفلوطی کے تمام ہی افسانے خواہ وہ فرانسیسی سے ترجمہ ہیں یا طبع زاد ہیں سماجی اصلاح سے متعلق ہیں۔(۱۲)

منفلوطی کے مقالات: النظرات

ان کی یہ تصنیف تین جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کا بیشتر حصہ ان مقالات کا ہے جو منفلوطی نے اس صدی کے اوائل میں رسالہ المویّد میں تحریر کیے تھے (جس کے مدیر شیخ علی یوسف تھے) کچھ تنقیدی مضامین، کچھ تراجم اور کہانیاں بھی اس میں شامل ہیں۔(۱۳)

منفلوطی کے مقالات کے دو پہلو نمایاں ہیں۔ایک ان کا اسلوب دوسرے موضوعات، دراصل منفلوطی نے قدیم علوم وادب اور جدید مغربی ومشرقی ادب کے وسیع مطالعہ کے نتیجے میں فن مقالہ نویسی میں ایک دلچسپ اور خوبصورت اسلوب اختیار کرلیا۔ وہ اخباری صحافت کے آدمی نہ تھے لیکن مقالات کے صحافیانہ رموز سے آگاہ تھے۔ان کے مقالات کے موضوعات معاشرتی زندگی کے مسائل کے گرد گھوم رہے ہیں۔النظرات کی جلد اول کے چند موضوعات یہ ہیں۔الغد (کل)، الدفین الصغیر (مدفون بچہ)، أین الفضیلۃ؟ (اخلاق کہاں ہیں؟)، الغنی والفقیر (دولت منداور ضرورت مند)، الرحمۃ (رحم)، الصدق والکذب (سچ اور جھوٹ)، الحریّۃ (آزادی)، اسلام اور مسیحیت، خودکشی، محبت اور شادی، شادی کا حسن، بخل، مچھر اور انسان۔(۱۴)

منفلوطی کا انداز تحریر سرسید کے مضامین ومقالات سے ملتا جلتا ہے سرسید کا مضمون ''تکرار'' اور منفلوطی کا مضمون دولت منداور ضرورت منداایک ہی رنگ لیے ہوئے ہیں۔مضمون کی ابتدا ایسے دلچسپ انداز سے کی گئی ہے کہ یہ قاری کی پوری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔مضمون ملاحظہ ہو۔(ضمیمہ نمبر۲ دیکھیے)

حاصل مطالعہ:

☆ منفلوطی کے افسانے کلاسیکیت اور رومانسیت کا حسین امتزاج ہیں جن میں حُسنِ الفاظ اور حُسنِ معنی کی رعنائی ہے۔ البتہ کہانی روایتی ہے۔واقعیت (Realism) میں کئی مدّ وجزر ہیں۔ان کا بنیادی مقصد معاشرتی اصلاح ہے۔

☆ مقالات میں بھی کلاسیکیت اور رومانسیت نمایاں ہے جیسا کہ ہم ان کے مضمون ''دولت منداور ضرورت مند'' میں دیکھتے ہیں۔اِن مقالات کا محور بھی معاشرتی مسائل ہیں۔

☆ افسانے ہوں یا مقالات، ہر تحریر میں سلاست وروانی ہے۔ترجمہ میں تعریب وتمصیر ہے۔

مراجع وحواشی

(۱) شوقی ضیف ڈاکٹر: الادب العربی المعاصر فی مصر، ص ۲۲۷-۲۲۸ (دار المعارف قاہرہ ۱۹۷۹)

(۲) غربال، محمد شفیق: الموسوعۃ العربیۃ: ج ۲ ص ۴۳۱ ط: دار الشعب، قاہرہ

(۳) Abdul-Aziz Abdul-Megeid: The Modern Arabic Short Story. P:95-97, Al-Ma'arif Press, Cairo-1955

(۴) احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی، ص: ۲۴۹، چوبیسواں ایڈیشن (مطبعۃ الرسالۃ قاہرہ)

(۵) المنفلوطی، مصطفیٰ لطفی: النظرات، نوان ایڈیشن (مطبعۃ الاستقامۃ قاہرہ ۱۹۴۸)

(۶) منفلوطی، مصطفیٰ لطفی: العبرات، ص ۱۸۴ (نعمانی کتاب خانہ حق اسٹریٹ، اردو بازار لاہور، تاریخ ندارد)

(۷) شوقی ضیف: ایضاً، ص ۲۲۹

(۸) محمود حامد شوکت، ڈاکٹر: مقومات القصۃ العربیۃ فی مصر، ص ۲۴۸-۲۴۹ (دار الجیل پریس، الفجالۃ، قاہرۃ ۱۹۷۴)

(۹) محمود تیمور: دراسات فی القصۃ والمسرح، ص ۲۰۔۲۱، مکتبۃ الآداب قاہرہ، ۱۹۷۷ء

(۱۰) نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر: اردو مختصر افسانہ، فنی و تکنیکی مطالعہ، ص ۵۶-۵۸ (بک وائز لاہور، طبع اول ۱۹۸۸ء)

(۱۱) منفلوطی: ''العبرات'' ص ۲ - منفلوطی کے اس افسانے کی آزاد ترجمانی اور تلخیص پیش کی جارہی ہے اس میں مترجم نے منفلوطی کے افسانے کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو منفلوطی نے فرانسیسی افسانوں کے عربی ترجمہ میں روا رکھا تھا۔ (مترجم اسحٰق) تقابل کے لیے حبیب اشعر دہلوی کا ترجمہ ''جب رخ سے نقاب اٹھی'' ص: ۱۳۸۔۱۶۰، مطبوعہ آئینۂ ادب، لاہور ۱۹۶۹ء دیکھیے۔

(۱۲) احمد حسن الزیات: ایضاً ص ۲۴۹

(۱۳) احمد حسن الزیات، تاریخ الادب العربی، ترجمہ عبدالرحمان طاہر سورتی، ص ۶۴۲، ۶۴۳ (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۱)

(۱۴) منفلوطی: النظرات، ص ۴۱، ۴۹، ۵۵، ۶۰، ۷۸، ۱۰۵، ۱۱۶، ۱۲۸، ۱۶۶، ۱۷۱، ۲۱۰، ۲۱۵

(ضمیمہ نمبر ۱) الیتیم کے آزاد ترجمہ کے چند صفحات پیش خدمت ہیں:

یتیم۔(۱) ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

میرے پڑوس کی بلڈنگ کے اوپر والے کمرے میں کچھ دن سے ایک نوجوان رہائش پذیر ہے۔ اس کی عمر ۱۹ یا ۲۰ برس ہوگی۔ شاید وہ مصر کے کسی سیکنڈری یا ہائر سیکنڈری اسکول کا طالب علم ہے۔ میں اسے اپنے اسٹڈی روم کی کھڑکی سے اکثر دیکھتا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے ڈھیر ہوتا۔ میں دیکھتا کہ ایک پژمردہ، نحیف ونزار کمزور نوجوان ایک جلتے ہوئے چراغ کے سامنے کمرے کے کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ کبھی کسی کتاب میں نظریں گاڑے ہوئے ہے اور کبھی کسی کاپی میں کچھ لکھ رہا ہے، کبھی کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کبھی کوئی سبق دہرا رہا ہے میں نے کبھی بھی اس کے معاملات پر توجہ نہیں دی۔ البتہ ایک مرتبہ سردی کی لمبی رات تھی۔ تقریباً آدھی رات کو میں اپنے گھر واپس آیا۔ مجھے کسی ضرورت کے لیے اسٹڈی روم میں جانا پڑا تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی نوجوان اسی انداز میں ٹیبل لیمپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ کتاب اس کے

سامنے پھیلی ہوئی ہے اور اس کا ماتھا کتاب پر ٹکا ہوا ہے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یا تو وہ پڑھائی سے تھک گیا ہے یا رت جگے کے اثرات ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ میں بستر پر جانے کی بجائے اسی جگہ پر کھڑا اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنا سر کتاب پر سے اٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی دونوں آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سوجھی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جس کتاب پر وہ سر رکھے ہوئے تھا وہ آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی بلکہ بہت سارے الفاظ آنسوؤں کی روانی کی وجہ سے مٹ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے قلم اٹھایا اور حسب عادت لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر غم کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس خاموشی اور تاریک رات میں اس پریشان اور تنہا نوجوان کو ایک خالی کمرے میں دیکھ کر جہاں پر سردی سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی آگ کی انگیٹھی تھی، گردشِ دوراں نے جسے وقت سے پہلے تکلیفوں اور مصیبتوں میں گرفتار کر لیا تھا۔ جس کا نہ کوئی غم خوار تھا، نہ مددگار، میں نے سوچا اس تکلیف دہ اور کرب ناک منظر کے پیچھے کوئی ایسی مصیبت زدہ جان ہے جس کی رگ وپے میں زمانے کے آلام ومصائب سرایت کر چکے ہیں۔ میں اسی طرح کھڑا اسے دیکھتا رہا اور ہل نہیں سکا۔

(۲) افسانے کا درمیانی حصہ:

ایک دن میں خاموشی کے ساتھ اس گھر سے نکل گیا۔ میں نے اپنے نکلنے کی کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی اس گھر کو چھوڑتے ہوئے میری ملاقات چچازاد سے نہ ہو سکی البتہ پردے کے پیچھے سے میری نظر اس پر پڑی۔ وہ اپنے بستر پر سوئی ہوئی تھی یہ میرا اس سے آخری تعلق تھا:

ے انشا جی اٹھو اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کو لگانا کیا

ے ناگزیر آج ہوا جیسے بچھڑنا اپنا
کل کسی روز ملاقات بھی امکان میں ہے

ے زندگی کی یہ گھڑی ٹوٹتا پل ہے جیسے
کہ ٹھہر بھی نہ سکوں اور گزر بھی نہ سکوں

اس حال میں، میں نے اس گھر کو چھوڑ دیا جس میں زندگی کا ایک طویل وقت میں نے خوشیوں کے ساتھ گزارا تھا۔ جیسے کہ آدم کو جنت سے نکال دیا گیا میں وہاں سے حیران وپریشان غموں اور مصیبتوں سے نڈھال نکلا۔

ایسی جدائی جس کے بعد وصال نہ تھا۔ ایسی غربت جس کے دور ہونے کا کوئی امکان نہ تھا ایسی جفا جس کے بعد کسی وفا کی امید نہ تھی۔ نہ کوئی مونس نہ کوئی غم خوار۔

خوش حالی کے دنوں کے بچے ہوئے کچھ پیسے میری کل پونجی تھی اس سے بلڈنگ کی اوپری منزل پر میں نے یہ چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لیا لیکن اس میں ٹھہرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اللہ کی وسیع وعریض زمین میں نکل کھڑا ہوا کہ شاید میرے غموں اور دکھوں کا کہیں مداوا ہو جائے۔ کئی مہینوں تک میں نے دور دراز کے سفر کیے۔ جب ایک شہر میں کچھ دن گزارتا تھا تو وہاں کی زمین مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی اور میں دوسرے شہر میں چلا جاتا ایک جگہ مجھ پر سورج طلوع ہوتا تو دوسری جگہ غروب ہوتا بالآخر مجھے ایسا سکون نصیب ہو گیا جیسا سکون اس غم زدہ انسان کو حاصل ہوتا ہے جس کے غم کی شدت سے آنسو پلکوں میں رک جاتے ہیں لیکن بہہ نہیں سکتے۔ بہر حال مجھے اس پر صبر کرنا پڑا۔ سالانہ امتحان کا زمانہ آ گیا تو میں لوٹ آیا اور میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مجھے اس بھری دنیا میں تنہا سفر کرنا ہے میرا وجود اور عدم وجود برابر ہے میرا حاضر ہونا اور غیر حاضر ہونا ایک جیسا تھا۔ نزدیکی اور دوری میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیوں کہ۔

ے ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی (غالب)

میں اپنے آپ میں کھو گیا۔ اس جگہ اور اس کی یادوں سے دور رہ کر میں نے ماضی کو بھلانے کی کوشش کی۔

ے یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

(۳) افسانے کا اختتام:

پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور دھیمی آواز سے کہا شدت الم سے میرا سر پھٹ رہا ہے اور غم کی شدت سے میرا دل پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ اب مجھے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ آپ وعدہ کریں زندگی میں جو رفاقت نہ مل سکی اور اس کی آخری تمنا پوری ہونے کی مہلت ہی نہیں ملی، مرنے کے بعد مجھے اس کی رفاقت قبر میں فراہم کر دی جائے گی اور اس کی یہ آخری نشانی میرے سینے پر رکھ دی جائے گی۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس نے کہا: ''اب میں پورے سکون سے موت کی آغوش میں جاؤں گا۔ پھر اس نے آخری ہچکی لی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اب میں اس کی آخری وصیت کی تکمیل میں لگ گیا۔ اس کے کفن دفن کا سامان کیا اور اس کی چچازاد کے پہلو میں اس کی قبر بنانے میں کامیاب ہو گیا اور وصیت کے مطابق اس کے سینے پر اس کی چچازاد کا خط رکھ دیا۔ وہ زندگی میں تو اس کی پکار پر لبیک نہیں کہہ سکا لیکن اپنی جاں جانِ آفریں کے سپرد کر کے اس کی آواز پر آ گیا۔

اس طرح یہ دونوں سچے وفا شعار ایک جگہ مل گئے۔ محل کی وسیع وعریض فضائیں جن پر تنگ ہو گئی تھیں۔ موت کے بعد قبر کے گڑھے کی وسعتوں نے ان دونوں کو اپنے دل میں جگہ دے دی اور ان کی بے قرار روحوں کا یہ دعویٰ سچا ہو گیا کہ

ے جی کے ہم مل نہ سکے مر کے تو مل سکتے ہیں

(ضمیمہ نمبر۲) منفلوطی کے مضمون الفقیر والغنی کا ترجمہ: یہ ترجمہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی مرحوم کی مترجمہ کتاب ''تاریخِ ادبِ عربی'' سے لیا گیا ہے۔

دولت منداور غریب:

کل رات ایک غریب مفلس دوست کے ہاں گیا، وہ بھوک کے مارے تڑپ رہا تھا، اور پیٹ پکڑ کر کراہ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے کہا: بھوک کا مارا ہوں۔ میں نے اپنی حد تک اس کی دلداری کرنے کی کوشش کی۔ یہاں سے رخصت ہوکر ایک مال دار دوست سے ملنے گیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ بھی پیٹ پکڑ کر رو رہا ہے اور جس طرح وہ مفلس پیٹ میں درد محسوس کر رہا تھا، اسی طرح یہ مالدار بھی پیٹ کے درد میں مبتلا ہے۔ میں نے کہا: کیسی عجیب بات ہے! اگر یہ مالدار اپنی ضرورت سے زائد کھانا اس بھوکے غریب کو دے دیتا تو ان دونوں میں سے کوئی بھی پیٹ کے درد میں گرفتار نہ ہوتا۔ نہ غریب بھوک کے مارے نہ مال دار بسیار خواری کے سبب۔

دولت مند کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ اتنا کھائے جس سے اس کی بھوک مٹ جائے اور پیاس بجھ جائے لیکن وہ اتنا خودغرض ہے کہ غریب کی روٹی چھین کر وہ اپنی ڈائننگ ٹیبل سجاتا ہے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اس نے دولت مند کو سنگ دلی کی سزا دردِ شکم میں مبتلا کر کے دے دی تاکہ ظالم ظلم میں دلیر نہ ہوتے جائیں۔ انہیں بھی درد کا احساس ہو۔ وہ ضرب المثل کتنی سچی ہے کہ ''دولت مند کے پیٹ کا درد غریب کی بھوک کا انتقام ہے۔''

آسمان نے اپنا پانی نہیں روک لیا اور نہ ہی زمین کا سینہ تنگ ہوا کہ اس نے پیداوار سے انکار کر دیا ہو البتہ طاقت ور انسان نے کمزور انسان پر حسد کرتے ہوئے اس کا حق مار لیا اور اس کے حصے پر خود ہی قابض ہو گیا۔ اب غریب فاقہ کشی پر مجبور ہو گیا۔ ظلم کے مارے آہیں بھر رہا ہے۔ اس کی ہلاکت و بربادی کا سبب یہ سرمایہ دار اور عیش و عشرت کرنے والے دولت مند ہیں نہ آسمان نے ظلم کیا ہے اور نہ ہی زمین نے ستم کیا ہے۔

اگر میری کھوپڑی میں بھی ان لوگوں جیسی عقل ہوتی تو میں بھی ان دولت مندوں کی طرح سوچتا جو طاقتوروں کی دلیل کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''دولت کے ڈھیر لگانا ان کا حق ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہی حق ہے اسباب و وسائل کمزوروں کے بجائے طاقتوروں کے قبضے میں ہوں۔'' اگر طاقت ہی حق کا پیمانہ ہے تو وہ اس دلیل کو بنیاد بنا کر ان غریبوں کی روحوں کو بھی فنا کر دیں۔ طاقتور لوگ کس قدر ظالم اور سخت دل ہیں! وہ اپنے نرم گدوں پر آرام کی نیند سوتے ہیں اور ان کا پڑوسی جو سردی سے ٹھٹھرتا ہے اور تکلیف سے آہیں بھرتا ہے ان کی نیند میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ وہ قسم قسم کے کھٹے میٹھے کھانوں سے بھری ہوئی میز پر بیٹھتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی تکدر پیدا نہیں ہوتا کہ اس کے

بہت سے رشتہ دار ایسے ہیں جو اس دسترخوان کے بچے ٹکڑوں کے لیے بھوک سے بیتاب ہیں بلکہ ان امیروں میں ایسے بھی ہیں جن کے دل میں نہ رحم و مہربانی کا گزر ہے نہ حیا ان کی زبانوں کو لگام دیتی ہے۔ چنانچہ وہ فقیروں کے سامنے انہیں سنانے کے لیے اپنی آسودگی و خوش حالی کی داستانیں بیان کرتے ہیں اور اپنے زر و جواہر مال و اثاثہ کی گنتی کروانے کے لیے فقیروں سے خدمت لیتے ہیں تاکہ غریب کا دل توڑیں اور اس کی زندگی بدمزہ کردیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر بات اور ہر ادا سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم امیر ہیں اس لیے خوش نصیب ہیں اور تم فقیر ہو اس لیے بد بخت اور کم نصیب ہو۔

میں انسان کو انسان سمجھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تا آنکہ وہ احسان سے کام نہ لے اس لیے کہ میں انسان و حیوان کے درمیان جو صحیح حد فاصل قائم کرسکتا ہوں وہ احسان ہی ہے۔ مجھے یہاں تین قسم کے انسان ملتے ہیں ایک وہی جو کسی پر اس لیے احسان کرتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے ساتھ احسان کرانا چاہتا ہے۔ ایسا شخص مستبد و جبار ہے جو احسان کے معنی آدمی کو غلام بنا لینے کے سمجھتا ہے۔ دوسرا وہ انسان ہے جو اپنے اوپر احسان کرتا ہے اور دوسروں پر احسان نہیں کرتا۔ اس لالچی اور خودغرض انسان کو اگر معلوم ہوجائے کہ سیال خون کسی عمل سے جم کر سونا بن جاتا ہے تو وہ اس سونے کو حاصل کرنے کے لیے تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ تیسری قسم کا انسان وہ ہے جو نہ اپنے ساتھ احسان کرتا ہے نہ دوسروں کے ساتھ اور یہ احمق بخیل ہے جو اپنا پیٹ مار کر اپنے صندوق کا پیٹ بھرتا ہے۔ رہ گئی انسان کی چوتھی قسم جو دوسروں کے ساتھ احسان کرتا ہو اور اپنے ساتھ بھی احسان کرتا ہو تو میں اسے نہیں جانتا اور اب تک اس سے نہیں مل سکا اور میرا خیال ہے کہ اس قسم کے انسان کو ایک یونانی فلسفی دن میں چراغ لے کر ڈھونڈتا پھرتا تھا اور جب اس سے کسی نے پوچھا کہ ''کیا تلاش کررہے ہو؟'' تو اس نے جواب دیا تھا: ''انسان کو تلاش کررہا ہوں۔''